مجاہد حسین
لیکچرار اُردو، گورنمنٹ ڈگری کالج فار بوائز شالیمار ٹاؤن، لاہور
ڈاکٹر طاہر عباس طیب
استاد، شعبہ اردو، جی سی ویمن یونیورسٹی، سیالکوٹ

بیدی کے افسانوں میں سماجی شعور کی رو

Mujahid Hussain
Govt Degree College for Boys Shalimar Town China Scheme, Lahore.
Dr. Tahir Abbas Tayib
Assistant Professor, Department of Urdu, GC Women University, Sialkot.

Existance of Social Conscience in short Stories of Bedi

Rajinder Singh Bedi stands prominent among the twentieth century Urdu fiction writers. He has taken Urdu short story to new heights with his novel ideas and artistic excellence. He has offered a truthful representation of ethical human values in his fiction. The subject matter of his short stories distinguishes him from his contemporaries. Bedi has a keen eye on society. In his fictions, he has portrayed various aspects of society with his modern consciousness. He has artistically clarified the psychological aspects of human relationships with social faces. Bedi has described the realities of life with imagination and in a soft and gentle tone.

Keywords: *Urdu Fiction, Ethical human values, modern consciousness, psychological aspects, Social Awareness, Social Issues & Domestic Life.*

بیسویں صدی کے افسانوی ادب کی روایت کو جن قلم کاروں نے تقویت بخشی ہے، ان میں راجندر سنگھ بیدی کا نام اہم ہے۔ انھوں نے اپنے فکر و فن کی تازگی سے اردو افسانہ نگاری کو نئی بلندیوں سے ہم کنار کیا۔ یہ بات قابل غور ہے کہ سعادت حسن منٹو، راجندر سنگھ بیدی، عصمت چغتائی اور کرشن چندر کا تعلق بیسویں صدی کے اردو فکشن سے رہا ہے۔ مذکورہ فکشن نگاروں نے اپنے قلم سے انسانی زندگی کے مسائل کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان چاروں صاحب طرز فن کاروں نے اپنی تخلیقات میں سماج اور معاشرے کی حقیقی ترجمانی کی ہے۔ منٹو نے

طوائفوں کی قابل رحم زندگی کو خصوصی اہمیت دی ہے تو راجندر سنگھ بیدی نے انسانی و اخلاقی قدروں کو اپنے فن پاروں میں صداقت کے ساتھ پیش کیا ہے۔ عصمت چغتائی کے یہاں متوسط طبقے کی گھریلو زندگی بالخصوص خواتین کے سماجی، تعلیمی، تہذیبی اور اقتصادی مسائل کو مرکزیت حاصل ہے تو کرشن چندر کی تخلیقات میں حقیقت اور رومان کا حسین سنگم نظر آتا ہے۔ اردو فکشن کے اس عبوری دور میں صنف افسانہ خارجی و داخلی اور حقیقی ورومانی دنیا کا سفر کرتی رہی۔ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے منٹو، بیدی اور کرشن چندر کی ذہنی روش کا موازنہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "بیدی نے منٹو اور کرشن چندر کے تقریباً ساتھ ساتھ لکھنا شروع کیا تھا، لیکن کرشن چندر اپنی رومانیت اور منٹو اپنی جنسیت کی وجہ سے بہت جلد توجہ کا مرکز بن گئے۔ بیدی کو شروع ہی سے اس بات کا احساس رہا ہو گا کہ وہ نہ تو کرشن چندر جیسی رنگین نثر لکھ سکتے ہیں اور نہ ہی ان کے ہاں منٹو جیسی بے باکی اور بے ساختگی آسکتی ہے۔ چنانچہ وہ جو کچھ بھی لکھتے ہیں، سوچ سوچ کر لکھتے ہیں۔"(۱)

راجندر سنگھ بیدی کے افسانوں کے موضوعات ومسائل اور ان کا انداز پیش کش انھیں دوسرے معاصرین سے منفرد بناتا ہے۔ یوں تو بیدی نے مختلف اصناف سخن میں طبع آزمائی کی لیکن ان کا اصل تخلیقی جوہر ان کے افسانوی سرمائے میں آشکار ہے۔ بیدی کے افسانوی مجموعوں میں دانہ و دام''،''گرہن''،''مکتی بودھ''،''کوکھ جلی''،''اپنے دکھ مجھے دے دو''اور''ہاتھ ہمارے قلم ہوئے'' قابل ذکر ہیں۔ بیدی کی تخلیقات کا سارا حسن ان کے پرخلوص جذبے واحساس میں پنہاں ہے۔ بیدی کے یہاں ایک نوع کی سنجیدگی اور متانت ملتی ہے۔ انھوں نے غالبؔ کی مانند اردو افسانے کو غور و فکر کی عادت ڈالی۔ وہ لکھنے سے قبل سوچتے تھے اور لکھنے کے بعد بھی مسلسل غور و فکر کرتے تھے۔ ان کا تخلیقی عمل خلوص آمیز ریاضت سے عبارت ہے۔ اسی لیے ان کے افسانوں میں بعض اوقات آورد کا احساس ہوتا ہے۔ بیدی نے 'گرہن'' کے پیش لفظ میں اپنے مخصوص تخلیقی مزاج کی جانب اشارہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

> "جب کوئی واقعہ مشاہدے میں آتا ہے تو میں اسے من و عن بیان کر دینے کی کوشش نہیں کرتا بلکہ حقیقت اور تخیل کے امتزاج سے جو چیز پیدا ہوتی ہے، اس کو احاطہ تحریر میں لانے کی سعی کرتا ہوں۔"(2)

"لاجونتی" "بھولا" "گرم کوٹ" "گرہن" "پان شاپ" "اپنے دکھ مجھے دے دو" "دس منٹ بارش میں" "ایک باپ بکاؤ ہے" "کوکھ جلی" "لمبی لڑکی" "متھن" اور "صرف ایک سگریٹ" وغیرہ بیدی کے اہم افسانوں میں شمار کیے جاتے ہیں۔ پیش نظر افسانوں میں بیدی نے زندگی کی چھوٹی چھوٹی خوشیوں، امیدوں، آرزوؤں اور لطیف و نازک جذبات و احساسات کو نہایت والہانہ انداز میں پیش کیا ہے۔ وہ نہ تو ترقی پسند تحریک سے مرعوب ہوئے اور نہ ہی جدیدیت سے۔ بلکہ انھوں نے ہمیشہ فکر و فن کے امتزاجی حسن کا پاس رکھا۔ ڈاکٹر طاہر طیب کے نزدیک:

> "بیدی کے ہاں سماجی مشاہدہ بہت پختہ اور اسے وہ اپنے باطن کی بھٹی میں تپا کر صفحہ قرطاس پر اتارتے ہیں۔ بیدی کے ہاں موضوعات کے ساتھ ساتھ اسلوبیاتی اور تکنیکی حوالے سے کامیاب تجربے ملتے ہیں۔ ان کی تکنیک پر گرفت انتہائی مضبوط ہے۔ بیدی باقاعدہ ترقی پسند تحریک سے وابستہ نہیں تھے مگر ان کے افسانوں پر ترقی پسندانہ رجحان کے کافی اثرات واضح ہیں۔ بیدی کے ہاں انسان اور انسان کی باطنی اور خارجی کشمکش بنیادی موضوع کے طور پر سامنے آتی ہے۔ وہ انسانی جبلت کو خاص طور پر اپنے افسانوں کا موضوع بناتے ہیں۔"(۳)

تقسیم ہند کا المیہ بھی بیدی کی آنکھوں سے اوجھل نہیں رہا۔ اس موضوع پر مبنی "لاجونتی" جیسا افسانہ آج بھی اس المیے کی شدت کو تازہ کر دیتا ہے۔ قاری کو افسانے کی ہیروئن کے درد و غم میں اپنا درد و غم اور اس کے دل میں اٹھنے والی تڑپ میں اسے اپنی بے بسی و لاچاری محسوس ہوتی ہے۔ یوں ایک عورت کے داخلی و نفسیاتی کرب واضطراب کو تخلیقی گویائی عطا کی ہے۔

ہجرت کے طوفان میں لاجونتی کہیں بھٹک جاتی ہے۔ "دل میں بساؤ" کمیٹی کے تحت مغویہ عورتوں کی بحالی کی امیدیں جاگ جاتی ہیں۔ سندر لال کو اس کمیٹی کا سیکرٹری منتخب کیا جاتا ہے۔ طوفان کے تھم جانے کے بعد لاجونتی دوبارہ مل جاتی ہے۔ اس کا شوہر سندر لال اسے اپنے گھر میں پناہ دیتا ہے۔ وہ لاجو کو اپنی بیوی کے روپ میں قبول نہیں کرتا بلکہ وہ اس کی نظر میں ایک دیوی کی حیثیت اختیار کر جاتی ہے۔ سندر لال ایک دیوی کی طرح اس کی عزت اور احترام بھی کرتا ہے مگر بیوی کی محبت دینے سے قاصر ہے۔ اس طرح وہ جیتی جی پتھر کی مورت بنا دی جاتی ہے۔ بیدی نے اس افسانے میں طہارت کا مسئلہ پیش کرتے ہوئے مرد اساس معاشرے کے غیر انسانی رویے پر کڑی

چوٹ کی ہے۔ یہ افسانہ آج بھی مرد کی بالا دستی اور اس کے تعصب آمیز رویے سے جواب کا طلب گار نظر آتا ہے۔افسانہ "لاجونتی" اپنے موضوع اور انداز پیش کش کے اعتبار سے آج بھی Relevant ہے۔لاجونتی اپنی زخم خوردہ زندگی کو دوبارہ آراستہ کرنا چاہتی ہے۔ اپنی خوشیوں اور اپنے ارمانوں کی ان بکھری ہوئی کرچیوں کو چننا چاہتی ہے مگر سندر لال کی بے اعتنائی اسے یکسر توڑ کر رکھ دیتی ہے۔ ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

> " لاجونتی کی من کی بات من ہی میں رہی۔ وہ کہہ نہ سکی ساری بات اور چپکی چپکی دبکی پڑی رہی اور اپنے جسم کی طرف دیکھتی رہی جو کہ بٹوارے کے بعد اب 'دیوی' کا بدن ہو چکا تھا۔لاجونتی کا نہ تھا۔ وہ خوش تھی بہت خوش لیکن ایک ایسی خوشی میں سرشار جس میں ایک شک تھا اور وسوسے۔ وہ لیٹی لیٹی اچانک بیٹھ جاتی جیسے انتہائی خوشی کے لمحوں میں کوئی آہٹ پا کر ایکا یکی اس طرف متوجہ ہو جائے۔ "(۴)

یہ اقتباس لاجونتی کی نفسیاتی بے بسی اور اس کے داخلی جذبات و احساسات کو نمایاں کرتا ہے۔ وہ در حقیقت قسمت کی ماری ہوئی ایک ایسی عورت کا تصور ہے، جو بسنے کے بعد ایک بار پھر سے اجڑ جاتی ہے۔ وہ اپنی بے گناہی کے باوجود سزا بھگتنے پر مجبور کی جاتی ہے۔ بیدی نے افسانے کی ہیروئن لاجونتی کے توسط سے تقسیم اور ہجرت کی آندھیوں میں بھٹکی ہوئی لاتعداد مظلوم عورتوں کی عبرتناک داستان بیان کی ہے۔ بیدی کا افسانہ "لاجونتی" اپنے تھیم اور ٹریٹمنٹ کے اعتبار سے اپنا جواب نہیں رکھتا۔ بیدی نے قتل و خون اور فرقہ وارانہ فسادات کی براہ راست ترجمانی کے بجائے زندگی کی متانت و سنجیدگی کو فن کے قالب میں ڈھالا۔ ڈاکٹر مرزا حامد بیگ کے مطابق:

> " راجندر سنگھ بیدی کے افسانوں میں خارجی زندگی کی پیشکش کے دوران انسانی شخصیت کے داخلی عناصر اس قدر چپکے سے شامل ہو جاتے ہیں کہ محسوس تک نہیں ہوتا اور بیدی خارج اور داخل کا ایک ایسا مونتاج بننے میں کامیاب ہو جاتا ہے جسے زندگی کہتے ہیں۔ "(۵)

راجندر سنگھ بیدی کا عہد سیاسی و تہذیبی انتشار، اقتصادی و مذہبی بے راہ روی اور طبقاتی کشمکش سے عبارت ہے۔ ایک طرف اشتراکی فلسفے کی احتجاجی چنگاریاں شعبہ ہائے زندگی کے منفی رویے کو جھلسا دینے کے لیے بے تاب تھیں تو دوسری جانب اہل وطن کے پیروں میں پڑی ہوئی غلامی کی آہنی زنجیر کو کاٹ پھینکنے کی جد و جہد بھی جاری تھی۔ عالمی سطح پر بھی غیر معمولی تبدیلیاں رونما ہو رہی تھیں۔ زندگی کے دوسرے اہم شعبوں کی طرح مختلف

زبانوں کی ادبیات بھی فطری طوران تبدیلیوں سے دوچار ہوئیں۔ ترقی پسند تحریک کا پہلا اجلاس نئے افکار و نظریات کا پیش خیمہ ثابت ہوا۔ دوسرے فن کاروں کی طرح بیدی کے ذہن پر بھی نئے انداز فکر کے دور رس اثرات مرتب ہوئے۔ اس بات سے انکار ممکن نہیں کہ بیدی کے یہاں بھی پریم چند کے فکری و نظریاتی نقوش ثبت ہوئے۔ انھوں نے پنجاب کے دیہی علاقوں کی سماجی، سیاسی، مذہبی، تہذیبی اور ثقافتی قدروں کو شعوری طور پر پیش کیا ہے۔ رانو، تلوکا، سندر لال، لاجو، اندو، مدن، مایا، کیرتی، ہولی، بھولا اور روپ متی جیسے کردار راجندر سنگھ بیدی کی تہذیبی و تخلیقی جڑوں کی نشاندہی کرتے ہیں۔

راجندر سنگھ بیدی ایک حقیقت نگار تخلیق کار کی شکل میں ہمارے سامنے آتے ہیں۔ اسی لیے ناقدین ادب نے بیدی کا موازنہ چیخوف، گورکی اور موپاساں جیسے مغربی فن کاروں سے کیا ہے۔ بیدی مارکس اور فرائڈ کے فلسفہ اشتراکیت اور تحلیل نفسی سے بھی متاثر تھے لیکن انھوں نے کبھی بھی ان افکار و نظریات کو اپنی تخلیقات کی اساس نہیں بنایا۔ مغربی فکر و فلسفہ سے واقفیت کے باوجود انھوں نے اپنے ملک کی معاشرتی، تہذیبی و ثقافتی قدروں نیز یہاں کی اساطیری اور دیومالائی نظام فکر کو مرکزیت دی۔ ان کے افسانوں میں سفاک حقیقت نگاری اور بے جا داخلیت کی تلاش فضول ہے۔ کنہیالال کپور کے مطابق:

> "بیدی اس وقت بھی ترقی پسند تھا جب لوگ ترقی پسندی کا مفہوم بھی اچھے طرح نہیں سمجھ سکتے تھے۔ وہ خود نچلے طبقے میں پیدا ہوا اور اس طبقے سے محض ہمدردی نہیں بلکہ عشق تھا۔ اس نے ہمیشہ اس طبقے کی نمائندگی کی ہے کہ آنے والے دور میں اگر بیدی کو ہندوستان کا گورکی سمجھ لیا جائے تو بہت کم لوگوں کو تعجب ہو گا۔"(۶)

بیدی نے کسی نظریے سے مرعوب ہو کر افسانے نہیں لکھے اور نہ ہی ذہن پر بٹھائے گئے کسی بھی فکری پہرے کو من و عن قبول کیا۔ بیدی باقاعدہ ترقی پسند تحریک سے وابستہ نہیں رہے مگر ان کے افسانوں پر ترقی پسندانہ رجحان ملتا ہے۔ بیدی کے ہاں انسان اور انسان کی باطنی و خارجی کشمکش بنیادی موضوع کے طور پر سامنے آتی ہے۔ وہ انسانی جبلت کو خاص طور پر اپنے افسانوں کا موضوع بناتے ہیں۔ ایک انٹرویو کے دوران بیدی نے نریش کمار شاد سے کہا تھا کہ:

> "تحریک تو جاری ہے لیکن اس کو اس قید و بند سے ہم نے نکال دیا ہے۔۔۔۔ وہ نہیں مانیں گے۔ آزادی سے لکھیں گے جو کچھ لکھنا چاہتے ہیں۔ ہم نے ان سے آزادی کا یہ

حق چھین کر حاصل کیا ہے۔ اوراب وہ بھی ہمارے پاس سے منھ چھپا کر نکل جاتے ہیں۔ ہمیں کچھ نہیں کہہ پاتے کیوں کہ ہم ان کی حدوں سے آگے نکل چکے ہیں۔"(۷)

بیدی کی فکری اور نظریاتی وابستگی کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ کسی تحریک یا رجحان کی ادعائیت اور مقصدیت سے قطع نظر بیدی نے زندگی کے عام مسائل کو ایک سچے ادیب و قلم کار کی نظر سے دیکھا۔ وہ قارئین کے دلوں میں رشتے کے کسک آمیز جذبات واحساسات اور سوزوگداز پیدا کرنے کا ہنر جانتے ہیں۔ ان کے افسانے قاری کو آنسو بہانے پر مجبور نہیں کرتے بلکہ لطیف جذبات واحساسات کی دھیمی دھیمی آنچ میں سلگنے پر مجبور کرتے ہیں۔

"بھولا" راجندر سنگھ بیدی کا مشہور افسانہ ہے۔ اس میں ایک بچے کی معصومانہ نفسیات کو معنوی تہداریوں کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ بھولا اپنے بابا سے دن میں کہانی سننے کی ضد کرتا ہے۔ لیکن بابا اسے سمجھاتے ہیں کہ دن میں کہانی کہنے سے مسافر راستہ بھول جاتا ہے۔ لیکن بھولا کی معصومانہ ضد کے سبب بابا اسے سات شہزادوں اور شہزادیوں کی کہانی سناتے ہیں۔ اتفاق سے اسی دن بھولا کے ماما کو اپنی بہن مایا کے یہاں آنا ہے اور کسی وجہ سے انھیں گھر پہنچنے میں تاخیر ہو جاتی ہے۔ گھر کے تمام افراد ان کا بے صبری سے انتظار کرتے ہیں۔ اسی انتظار میں رات ہو جاتی ہے۔ بھولا دن کی بات یاد کر کے پریشان ہو جاتا ہے کہ دن میں کہانی سننے سے مسافر راستہ بھول جاتا ہے۔ خود بابا بھی یہ کہتے ہوئے کہانی سنانے پر راضی ہوئے تھے کہ "اب کوئی مسافر راستہ کھو بیٹھے تو اس کے تم ذمہ دار ہو"۔ اس ذہنی کشمکش میں بھولا اپنے ماما کو تلاش کرنے کی غرض سے اندھیری رات میں بتّی لے کر چپکے سے گاؤں کے باہر نکل پڑتا ہے۔ اس کی ماں مایا کی جب نیند کھلی تو بھولا بستر سے غائب تھا۔ مایا کے شوہر اس دنیا میں نہیں ہیں۔ ایک بیوہ ماں کی تمام تر خوشیاں وامیدیں اپنی اکلوتی اولاد بھولا سے وابستہ ہیں۔ مایا اسے کوئی حادثہ سمجھ کر پاگلوں کی طرح دہاڑیں مار مار کر رونے لگتی ہے۔ وہ بھولا کے غم میں بے ہوش ہو جاتی ہے۔ بھولا کی گمشدگی کی خبر سن کر پاس پڑوس کی عورتیں بھی جمع ہو جاتی ہیں۔ اسی افراتفری اور شور شرابے میں دروازہ اچانک سے کھلتا ہے اور مایا کا بھائی ایک ہاتھ میں بتّی، سر پر مٹھائی کا ٹوکرا اور بھولا کو گود میں لیے اندر داخل ہوتا ہے۔ مایا تیزی سے آگے بڑھتی ہے اور اپنے بھائی کی گود سے بھولا کو چھین کر اسے بے اختیار چومنے لگتی ہے۔ بھولا کے آجانے کے بعد غم کا ماحول یکلخت خوشی میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ مایا کے بھائی روداد سناتے ہوئے کہتے ہیں:

" باباجی نے آدوپہر کے وقت مجھے کہانی سنائی تھی اور کہا تھا کہ دن کے وقت کہانی سنانے سے مسافر راستہ بھول جاتے ہیں۔ تم دیر تک نہ آئے تو میں نے جانا کہ تم راستہ بھول گئے ہو اور بابا نے کہا تھا کہ اگر کوئی مسافر راستہ بھول گیا تو تم ذمہ دار ہوگے۔"(۸)

پیش نظر اقتباس میں بیدی کا فنی حسن اپنے نقطۂ عروج پر ہے۔اس افسانے میں بیدی نے ایک بچے کی نفسیات اور ماں کی شفقت آمیز ممتا و محبت کو پیش کیا ہے۔بظاہر یہ موضوع معمولی ہے لیکن بیدی نے اسے غیر معمولی بنا کر پیش کیا ہے۔ ہندوستان کی اساطیری روایات کو بروئے کار لاتے ہوئے انھوں نے بھولا جیسا لازوال اور شاہکار افسانہ تخلیق کیا۔ در حقیقت ہندوستانی روایات اور اساطیری قدریں ہی ان کی تخلیقات کو گہری معنویت سے ہم کنار کرتی ہیں۔ڈاکٹر نگہت ریحانہ خان لکھتی ہیں۔

"وہ حقیقت کو معمہ بنا کر پیش کرنے کے عادی نہیں تھے۔ان کے یہاں حقیقت کتنی ہی تلخ ہو، سیدھی سادی ہوتی ہے اور سیدھے سادے انداز میں بیان کی جاتی ہے۔انھوں نے ادب اور زندگی کے تعلق کو متحرک، لچکدار اور سیال صورت میں پایا۔اسی لیے انھوں نے کسی میکانکی انداز میں اسے پیش نہیں کیا۔"(۹)

بیدی کے افسانوں کے خواتین کردار مزاحمتی اور احتجاجی قوت سے عاری ہیں لیکن ان میں ایثار و قربانی، خلوص و محبت، صداقت و سچائی اور انسانی قدروں کو زندہ رکھنے کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔ان کی ہیروئن اپنی خواہشات اور آرزوؤں کو پس پشت ڈال کر ٹوٹتے بکھرتے خاندان کی خوشیوں وامنگوں کو زندہ رکھتی ہے۔ بیدی کے افسانے "اپنے دکھ مجھے دے دو" اور "گرم کوٹ" اس کی عمدہ مثالیں ہیں۔ان افسانوں کے کردار انسانی رشتوں، اخلاقی قدروں اور مثبت و تعمیری جذبات و احساسات کا نہایت متوازن تصور پیش کرتے ہیں۔ افسانہ "اپنے دکھ مجھے دے دو" کی اندو اور مدن جیسے کردار اردو افسانے میں خال خال نظر آتے ہیں۔ آج کی اس مشینی زندگی میں سماجی رشتے ناطے اور انسانی قدریں تیزی سے زوال پذیر ہیں۔خلوص و محبت اور ایثار و قربانی کی جگہ حسد و دشمنی، مفاد پرستی اور خود غرضی کا دور دورہ ہے۔ایسے میں بیدی کے افسانے بالخصوص "اپنے دکھ مجھے دے دو" اور "گرم کوٹ" معاشرے کی زوال پذیر قدروں کو دوبارہ زندہ کرنے کی بھرپور صلاحیت رکھتے ہیں۔ان افسانوں کے کردار نہ تو فلسفیانہ گفتگو کرتے ہوئے نظر آتے ہیں اور نہ ہی زندگی کی زمینی سچائیوں سے نظریں چراتے

ہیں۔خواب وخیال اور تصوراتی دنیا میں کھوئے رہنے کی بجائے زندگی کو خوش حال اور کامیاب بنانے میں کوشاں نظر آتے ہیں۔

افسانہ ''اپنے دکھ مجھے دے دو'' میں مدن، اندو اور بابو دھنی رام جیسے کردار انسانی زندگی کی نہایت تلخ اور کڑوی حقیقت کو سامنے لاتے ہیں۔ یہ کردار افسانے کے پلاٹ کی ترنگوں پر ہچکولے کھاتے ہوئے زوال پذیر انسانی معاشرے کے لیے طنز و تازیانے کا حکم رکھتے ہیں۔ بیدی نے اس افسانے کے پلاٹ کا تانا بانا بابو رام دھنی کے کنبے کے توسط سے تیار کیا ہے۔افسانے کے ایک ایک لفظ سے بیدی کے تجربات و مشاہدات کی گہرائی محسوس کی جاسکتی ہے۔ بابو رام دھنی کی بیوی یعنی مدن کی ماں اب اس دنیا میں نہیں ہیں۔وہ کسی مہلک بیماری کے باعث اس جہان فانی سے کوچ کر جاتی ہیں۔ مدن کی ماں کے انتقال کے بعد اس گھر میں غم کی فضا چھا جاتی ہے۔لیکن مدن کی شادی کے بعد خوشی و امید کے نئے دریچے وا ہو جاتے ہیں۔مدن کی بیوی یعنی اندو اس گھر میں بیاہ کر لائی جاتی ہے۔بیدی نے یہاں خالص گھریلو ماحول کے سہارے افسانے میں جان پیدا کی ہے۔ایثار و قربانی اور خلوص و محبت کا پیکر اندو ایک وفاشعار بیوی اور ایک ذمہ دار بہو کے روپ میں اپنے ارمانوں کو بالائے طاق رکھتے ہوئے خوشیوں کے ہزاروں چراغ روشن کرتی ہے۔اس کی بے لوث قربانی و محبت سے بابو رام دھنی کے گھر کی تاریکی دیکھتے ہی دیکھتے روشنی میں تبدیل ہو جاتی ہے۔وہ بیک وقت کئی طرح کی ذمہ داریوں کو خوش اسلوبی سے نبھاتی ہے۔

افسانے کی ہیروئن اندو کبھی محبت کی دیوی بن کر مدن کی اجاڑ زندگی میں رنگ بھرتی ہے تو کبھی نیک بہو کی شکل میں اپنے سسر بابو رام دھنی کے بڑھاپے کا سہارا بنتی ہے۔علاوہ ازیں اندو مدن کے بھائی اور بہنوں کو بھی اپنی شفقت آمیز ممتا سے نوازتی ہے۔ماں کی شفقت سے محروم کندن، دلاری اور پاشی کی پرورش اندو کے زیر سایہ ہوتی ہے۔دلاری اکثر و بیشتر اوقات اپنی بھابھی سے چمٹی رہتی ہے۔ دلاری کی اس عادت سے مدن بعض اوقات ناراض بھی ہوتا ہے۔مدن اسے جونک اور چڑیل سے بھی تشبیہ دیتا ہے لیکن اندو اپنی مادرانہ شفقت اور محبت میں ذرہ برابر کمی نہیں کرتی۔اندو اپنی زندگی کے بیش بہا موتی لٹاتے ہوئے تین بچوں کو جنم دیتی ہے۔اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ اندو ایک مثالی عورت کے روپ میں افسانے میں نمودار ہوتی ہے۔زیر مطالعہ افسانہ کے اندر نفسیاتی ادراک اور اخلاقی قدروں کی گہری معنویت پوشیدہ ہے۔شادی کی پہلی رات میں مدن اپنی ماں کو یاد کر کے غمگین ہو جاتا ہے۔وہ چاہتے ہوئے بھی اپنی بیوی اندو سے سب کچھ نہیں کہہ پاتا۔شدید احساس کے باعث اس کا گلا روندھ جاتا ہے۔لیکن اندو اپنے شوہر مدن کے سینے میں دفن ہر درد و غم اور اداسی و مایوسی کو سمجھ جاتی ہے۔وہ اپنائیت اور فرط جذبات سے

مدن کو اپنی چھاتی سے لگا لیتی ہے۔ بیدی کی فنی و نفسیاتی بصیرت کا کمال ہے کہ ایسے لمحات میں اندو کے دل میں ایک بیوی سے کہیں زیادہ ماں کی ممتا جاگ اٹھتی ہے۔ اندو اپنے شوہر مدن کا ہاتھ پکڑتے ہوئے جذباتی انداز میں کہتی ہے:

"میں تو پڑھی لکھی نہیں ہوں جی پر میں نے ماں باپ دیکھے ہیں، بھائی اور بھابیاں دیکھی ہیں...... اس لیے میں کچھ سمجھتی بوجھتی ہوں...... میں اب تمہاری ہوں۔ اپنے بدلے میں تم سے ایک ہی چیز مانگتی ہوں۔"

روتے وقت اور اس کے بعد بھی ایک نشہ سا تھا۔ مدن نے کچھ بے صبری اور کچھ دریا دلی کے ملے کلے شبدو میں کہا۔

"کیا مانگتی ہو؟ تم جو بھی کہو گی میں دوں گا۔"

"پکی بات؟" اندو بولی

مدن نے کچھ اتاولے ہو کر کہا___ ہاں، ہاں___ کہا جو پکی بات۔"

لیکن اس بیچ میں مدن کے من میں ایک وسوسہ آیا۔ میرا کاروبار پہلے ہی مندا ہے، اگر اندو کوئی ایسی چیز مانگ لے جو میری پہنچ ہی سے باہر ہو تو پھر کیا ہو گا؟ لیکن اندو نے مدن کے سخت اور پھیلے ہوئے ہاتھوں کو اپنے ملائم ہاتھوں میں سمیٹتے اور ان پر اپنے گال رکھتے ہوئے کہا:

"اپنے دکھ مجھے دے دو۔"(۱۰)

اس اقتباس میں انسانی و اخلاقی قدریں اپنی معراج کو پہنچی ہوئی ہیں۔ ایک ایک لفظ سے خلوص و محبت، ایثار و قربانی اور ممتا و شفقت کی روشنی پھوٹ رہی ہے۔ کسی گھر و خاندان، سماج و معاشرہ بلکہ پوری انسانیت کے تحفظ کے لیے ایسی بیش بہا قدریں ناگزیر ہیں۔ اندو کی زبان سے ادا ہونے والا جملہ "اپنے دکھ مجھے دے دو" بظاہر سادہ و عام فہم ہے لیکن اس کے اندر حیات و کائنات کی بے پایاں وسعت پوشیدہ ہے۔

قابل غور ہے کہ تین بچوں کو جنم دینے اور گھریلو ذمہ داریوں میں منہمک رہنے کے سبب اندو رفتہ رفتہ اپنی کشش کھو دیتی ہے۔ ایسے میں مدن ایک عجیب کشمکش کا شکار ہو جاتا ہے۔ اسی کشمکش میں اس کے قدم بہک جاتے ہیں۔ وہ پرائی عورتوں میں دلچسپی لینے لگتا ہے۔ اندو کو جب اس بات کی خبر لگتی ہے تو اس کے پاؤں تلے زمین کھسک جاتی ہے۔ اسے اپنی کوتاہی کا شدید احساس ہوتا ہے۔ وہ ایک بار پھر سے اپنے شوہر کے لیے خود کو سنوارتی و سجاتی ہے

اور مدن کے دل کی مایوسی وویرانی کو چمن زار میں تبدیل کر دیتی ہے۔اندو پہلی رات کی دلہن کا روپ دھارن کر کے مدن سے بے اختیار لپٹ جاتی ہے۔ بیدی نے افسانے کی ہیروئن اندو کے کے پس پردہ عورت کی عظمت اور تقدس کے مختلف جہتوں کو پیش کیا ہے۔انسانی نفسیات کے نباض بیدی نے اندو کی اچھائیوں کے ساتھ ساتھ اس کی خامیوں اور کوتاہیوں کو بھی ملحوظ خاطر رکھا ہے۔یہ افسانہ مدن اور اندو کی گھریلو زندگی کے علاوہ پوری کائنات کو اپنے اندر سمیٹ لینے کی قوت رکھتا ہے۔۔ڈاکٹر اسلم جمشید پوری رقمطراز ہیں:

> "بیدی کا بڑا وصف، نفسیاتی مطالعہ اور کردار نگاری ہے وہ کردار میں ڈوب جاتے ہیں اور کردار کو اپنی مرضی سے پھلنے پھولنے کا موقع عطا کرتے ہیں۔ ان کے ہر افسانے کے اختتام پر، مرکزی کردار کا گہرا نقش قاری کے ذہن پر ثبت ہوتا ہے۔ "(۱۱)

افسانہ "گرم کوٹ" ایک کلرک کی خستہ حال زندگی کا قصہ بیان کرتا ہے لیکن اس میں انسان کی ازلی محرومی وناکامی کا المیہ نظر آتا ہے۔اس افسانے کی بنیاد بھی ایک چھوٹے سے کنبے کی گھریلو زندگی پر رکھی گئی ہے۔ شمی اپنے شوہر اور بچوں کے ساتھ زندگی کے شب وروز گزارتی ہے۔یہ کنبہ سخت محنت ومشقت کے باوجود اپنی خواہشات کو بھی پورا کرنے میں ناکام نظر آتا ہے۔افسانے کا پلاٹ ایک کوٹ کے گرد گردش کرتا ہوا نظر آتا ہے۔بیدی کی فنی بصیرت کا کمال ہے کہ یہ کوٹ اس فیملی کی ناآسودہ خواہشات کی علامت بن گیا ہے۔ اس گرم کوٹ کے پس پردہ انسان کی جھلستی ہوئی حسرتوں اور دم توڑتی خواہشات کی ترجمانی کی گئی ہے۔

یہ افسانہ متوسط طبقے کی گھریلو زندگی کی آفاقی قدروں کی معنویت کو اجاگر کرتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ پیش نظر افسانہ پریم چندر کے "کفن" اور کرشن چندر کے "کالو بھنگی" سے موضوعاتی وفکری مناسبت کے باوجود اپنی منفرد شناخت رکھتا ہے۔اس افسانے میں بیدی کی تخلیقی ہنرمندی اور فنی عظمت اپنے عروج پر ہے۔شمی ایک وفا شعار بیوی کی شکل میں نمودار ہوتی ہے۔وہ کفایت شعاری،متانت اور احساس ذمہ داری کا پیکر ہے۔اپنے جائز و مناسب ارمان و خواہشات کی قربانی دے کر افراد خانہ کے چہروں پر امید وخوشی سجانے کی والہانہ کوشش کرتی ہے۔وہ اپنے شوہر کے ہزار سمجھانے پر بھی اپنے لیے مینار کانٹے نہیں لیتی۔

اس کا شوہر ڈاک خانے میں ایک معمولی کلرک ہے۔ اس کی ماہانہ تنخواہ گھر کے خرچ کے لیے ناکافی ہے۔کباڑیئے کی دکان سے خریدا ہوا اس کے شوہر کا بوسیدہ کوٹ، گھر کی پستی اور خستہ حالی کی علامت بن گیا ہے۔ اس کوٹ میں جگہ جگہ کئی سوراخ ہیں۔گھریلو ذمہ داریوں اور دوسری ناگزیر وجوہات کے پیش نظر وہ اپنے لیے

نیا کوٹ سلوانے کا ارادہ ترک کر دیتا ہے۔ لیکن جب وہ معراج الدین ٹیلر کی دکان سے گزرتا ہے تو اس کے دل میں نئے کوٹ کی دیرینہ حسرتیں جاگ اٹھتی ہیں۔ خانگی ذمہ داریوں کو نبھاتے ہوئے اپنی محرومی و نامرادی میں بھی اسے یک گونہ سکون ملتا ہے۔ کیوں کہ شمی کی طرح وہ بھی ایک ذمہ دار باپ اور نیک دل شوہر ہے۔ وہ اپنی بیوی اور بچوں کی خواہشات کی تکمیل کو ہی اپنی زندگی کا مقصد سمجھتا ہے۔ اس کی بیوی شمی اکثر و بیشتر اسے نیا کوٹ سلوانے کی ضد کرتی ہے مگر اس کا شوہر کسی نہ کسی بہانے اپنی بیوی کو ٹال دیتا ہے۔ ایک بار شمی اس کے بوسیدہ کوٹ میں اپنی پتلی پتلی انگلیاں ڈالتے ہوئے نہایت محبت آمیز لہجے میں کہتی ہے:

> ''اب تو یہ بالکل کام کا نہیں رہا''
>
> میں نے دھیمی سی آواز سے کہا ''ہاں!''
>
> ''سی دوں؟...... یہاں سے''
>
> ''سی دو، اگر کوئی ایک آدھ تار نکال کر رفو کر دو تو کیا کہنے ہیں۔''
>
> کوٹ کو الٹتے ہوئے شمی بولی ''استر کو تو موئی ٹڈیاں چاٹ رہی ہیں...... نقلی ریشم کا ہے نا...... یہ دیکھیے...... آخر آپ اپنے کوٹ کے لیے کپڑا کیوں نہیں خریدتے؟''(۱۲)

شمی کا شوہر بازار سے واپسی کے دوران پشپا منی کے لیے گلاب جامن اور امرتیاں خریدنے کی غرض سے مٹھائی کی دکان پر جاتا ہے۔ دکان پر کھولتے ہوئے تیل میں کچوریاں دیکھ کر اس کے منہ میں پانی بھر آتا ہے۔ وہ پتھر کی میز پر کہنیاں ٹکا کر جی بھر کے کچوریاں کھاتا ہے۔ پریم چند کے افسانہ ''کفن'' میں بھی کچوریوں کا ذکر موجود ہے۔ مادھو اور گھیسو بدھیا کے کفن کے لیے ملنے والے پیسوں سے کچوریاں کھاتے ہیں۔ وہ اپنی اس غیر انسانی حرکت کا جواز پیش کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ''آخر کفن لاش کے ساتھ جل ہی تو جاتا ہے۔'' دونوں افسانوں کی صورت حال قدرے مختلف ہوتے ہوئے بھی ان میں ایک معنوی ربط اور منطقی جواز ہے۔ دونوں جگہوں پر کچوریاں ناآسودہ خواہشات کی علامت بن گئی ہیں۔ کچوریاں کھانے کے بعد پیش آنے والی تعجب خیز صورت حال اس کے دل کو احساس ندامت سے بھر دیتی ہے۔ اقتباس پیش خدمت ہے:

> ''ایک لمحے میں یوں دکھائی دینے لگا جیسے کوئی بھولی سی بھیڑ اپنی خوبصورت، ملائم سی اون اتر جانے پر دکھائی دینے لگتی ہے۔
>
> حلوائی بھانپ گیا۔ خود ہی بولا۔

"کوئی بات نہیں بابو جی پیسے کل آجائیں گے۔"

میں کچھ نہ بولا۔ کچھ بول ہی نہ سکا۔

صرف اظہار تشکر کے لیے میں نے حلوائی کی طرف دیکھا۔ حلوائی کے پاس ہی گلاب جامن چاشنی میں ڈوبے پڑے تھے۔ روغن میں پھولتی ہوئی کچوریاں کے دھوئیں میں سے آتشیں سرخ امرتیاں جگر پر داغ لگا رہی تھیں اور ذہن میں پشیامنی کی دھندلی سی تصویر پھر گئی۔"(۱۳)

اس واقعے کے بعد شمی کے شوہر کی حسرت آمیز دنیا اجڑ جاتی ہے۔ کیوں کہ اس دس کے نوٹ پر افراد کنبہ کی نظریں جمی ہوئی تھیں۔ نوٹ کا کھو جانا در اصل معنوی تہہ داری کا بلیغ اشاریہ ہے۔ حسن اتفاق سے دس روپے کا نوٹ مل جاتا ہے۔ گویا امیدوں کے دوبارہ زندہ ہو جانے کی راہیں نکل آتی ہیں۔ یہ بات اس کے اہل خانہ کے لیے کسی کرشمہ سے کم نہ تھی۔ اسے کوٹ کے پشت میں کسی چیز کے سرکنے کا احساس ہوتا ہے۔ وہ اسے سرکاتے ہوئے دائیں جیب کے سوراخ سے باہر نکالتا ہے، جو اندر ہی اندر کہیں گم ہو گیا تھا۔ لیکن اس کے دوبارہ مل جانے پر اس کی آنکھوں میں چمک پیدا ہو جاتی ہے۔ بیدی کی تخلیقی جدت پسندی کا ایک خاص پہلو یہ بھی ہے کہ وہ گھریلو زندگی کی معمولی سی معمولی خوشیوں کو بھی نظر انداز نہیں کرتے۔ ان کے افسانوں میں ایسی بے شمار مثالیں موجود ہیں۔ توجہ طلب نکتہ ہے کہ نوٹ کے دوبارہ مل جانے پر وہ ایک بار پھر سے چیزوں کی فہرست تیار کرنے میں مصروف ہو جاتا ہے۔ شمی نے اپنے شوہر کے ہاتھ سے کاغذ چھینا اور اسے پھاڑ دیا۔

شمی کے شوہر کی زبان سے ادا ہونے والا بلیغ و فکر انگیز جملہ "نہ تخیل اتنا رنگین ہو اور نہ محرومی سے اتنا دکھ پہنچے" کو افسانے کا کلیہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ یہ فطری بات ہے کہ حد سے بڑھی ہوئی امیدیں و حسرتیں طلسمی سانپ کی مانند ہوتی ہیں، جو انسان کی رگوں میں غم و محرومی کا زہر اتار دیتے ہیں۔ بیدی نے انسانی زندگی کی اس تلخ حقیقت کو تخلیقی توانائی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ انھوں نے "گرم کوٹ" کی شکل میں اردو فکشن کو ایک ایسا لافانی افسانہ دیا ہے، جو ہمارے خوابیدہ جذبات و احساسات کو بیدار کرتا رہے گا۔ ڈاکٹر محمد حسن لکھتے ہیں۔

"تکنیک کے اعتبار سے متوازی، رمزیت اور تہہ داری کا استعمال جس طرح بیدی نے کیا ہے اس نے اردو افسانے کو ایک نئی منزل پر پہنچا دیا ہے۔ ابھی تک اردو افسانے کو اتنا محتاط آرٹسٹ نہیں ملا۔"(۱۴)

بیدی کی قوت اظہار اور تخلیقی آب وتاب انھیں دیگر افسانہ نگاروں سے منفرد بناتی ہے۔ ان کی تخلیقات موضوعات ومسائل کے ساتھ ساتھ فنی وتکنیکی اعتبار سے بھی اپنی مثال آپ ہیں۔ انھوں نے اپنی زندگی کے تجربات ومشاہدات اور اپنی فکری بصیرت کی مدد سے فکروفن میں گہرا ربط پیدا کر دیا ہے۔ انہوں نے کردار نگاری، پلاٹ سازی اور زبان وبیان کے ہر ممکنہ فنی ذرائع و وسائل سے کام لیا ہے۔ ان کے افسانوں میں زبان وبیان، پنجابی اصطلاحات، اساطیری و دیومالائی عناصر اور نادر تشبیہات و استعارات سے ایک نئے ڈکشن کا احساس ہوتا ہے۔ اردو فکشن کے بیشتر ناقدین اس بات سے اتفاق رائے رکھتے ہیں کہ ان کی افسانوی کائنات ہندوستان کی تہذیبی و ثقافتی قدروں اور یہاں کی مذہبی ودیومالائی عناصر سے آراستہ و پیراستہ ہے۔ بیدی کی افسانہ نگاری کے فنی پہلو کے حوالے سے ڈاکٹر طارق چھتاری رقمطراز ہیں:

> "فکری وفنی تعمیر وتشکیل کے ساتھ ہی بیدی نے اردو افسانے کو نئے مزاج اور جدید رحجان سے ہم آہنگ کیا۔ انھوں نے بدلتے ہوئے معاشرے میں طبقاتی کشمکش اور ان کے ذہنی کرب وہیجان کو فکر وفلسفہ اور منفرد اسلوب کے ساتھ پیش کیا۔"(۱۵)

افسانوی مجموعہ "دانہ ودام" سے لے کر "ہاتھ ہمارے قلم ہوئے" میں شامل بیشتر افسانوں میں اساطیری ودیومالائی شعور اور ادراک کی کارفرمائی ملتی ہے۔ بلاشبہ بیدی کا اصل تخلیقی جوہر ان کے افسانوں میں مستعمل دیومالائی واساطیری طرز اسلوب میں ہی کھلتا ہے۔ استعاراتی وعلامتی طرز اظہار سے ان کے افسانوں میں غضب کی تہہ داری ومعنوی گہرائی پیدا ہو گئی ہے۔ ان کے ہاں پائی جانے والی اساطیری بنیادیں ان کے ہم عصروں کے یہاں مفقود ہے۔ ان کے دیومالائی علامتیں و استعارے اس قدر پیچیدہ نہیں کہ تفہیم سے بالاتر ہوں۔ بیدی کے افسانوں کی مذکورہ فکری وفنی خوبیاں انھیں دوسرے تخلیق کاروں سے ممتاز و منفرد بناتی ہیں۔ ان کے افسانوں میں ندرت و جدت پیدا کرنے کی شعوری کوششیں نظر آتی ہیں۔ ڈاکٹر محمد عالم خان رقمطراز ہیں۔

> "بیدی کے افسانوں کا بنیادی موضوع انسان کا باطن ہے۔ ان انسانوں کو جنھیں ہم ایک عرصے سے جانتے ہیں مگر اچانک ہم انھیں نئے انداز سے ملتے ہیں۔ وہ اپنے افسانے کے کرداروں کو انسانی روپ دے کر صحت مند اور نارمل بنا دیتے ہیں اور اگر غور کیا جائے تو ان کا تخلیقی سفر انسانوں کی جبلت کو سامنے لاتا ہے۔ یہ جبلت جو مختلف حالات واقعات

کے زیر اثر بدلتی رہتی ہے۔ ان کے ہر کردار میں زندہ رہنے کی بنیادی خواہش ہر قسم کی صورتحال میں رہتی ہے۔...“(۱۶)

”اپنے دکھ مجھے دے دو“”لاجونتی“”گرہن“”بھولا“”اغوا“”رحمان کے جوتے“”ایک چادر میلی سی“ اور متھن جیسے افسانے بیدی کے اساطیری اور استعاراتی اسلوب کی اچھوتی مثالیں ہیں۔ ان کے افسانوں میں مستعمل دیومالائی واساطیری عناصر کی تفہیم کے بغیر بیدی کی تخلیقی انفرادیت کی نشاندہی ممکن نہیں۔ انتظار حسین کے یہاں بھی اس نوع کی افسانوی فضا موجود ہے۔ لیکن ان کی تخلیقات اساطیری ودیومالائی اسلوب سے کہیں زیادہ داستانوی، حکایتی اور تمثیلی ہیں۔ بیدی کے افسانے کبھی شعوری تو کبھی غیر شعوری طور پر اپنے لیے اساطیری و دیومالائی سانچے تیار کرتے ہیں۔ راجندر سنگھ بیدی کے افسانوں میں مستعمل ساوتری، پاروتی، سیتا، بھوانی، دروپدی، درگا، کورو، یدھشٹر، پانڈو، راکھشش، دوشاسن، مدن، منتر اوم نمو بھگوتے واسودیو ایا جیسی اساطیری اصطلاحات افہام و تفہیم کی نت نئی جہتوں کو روشن کرتی ہیں۔ وارث علوی لکھتے ہیں:

"بیدی کے افسانوں کی ایک اہم خصوصیت ان کے موضوعات، تکنیک، اسالیب اور طریقہ کار کا تنوع ہے۔ ان کے یہاں تھیم، کردار، واقعات، ماحول اور طریقہ کار کی تکرار اور یک رنگی نہیں۔ ان کے یہاں تازگی اور تنوع ہے۔ ہر افسانہ ایک نئے موضوع، نئے تخلیقی تجربہ اور تازہ کار فنکارانہ برتاؤ سے ہمیں روشناس کراتا ہے۔“(۱۷)

بیدی معاشرے میں حقیقی زندگی کی فضا کو واضح طور پر دکھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ سادہ دل لوگوں کے عقائد میں جھانک کر ان کے دین دھرم اور نفسیاتی احساس کو اجاگر کرتے ہیں۔ وہ سماجی اقدار کی بدلتی ہوئی صورتحال سے واقف تو ہیں لیکن ان کی قدریں ماضی سے جڑی ہوئی ہیں۔ ان کے موضوعات میں انسانی فطرت وجبلت اور گھریلو زندگی کے دکھ سکھ کا بیان ملتا ہے۔ بیدی کے ہاں عورت کی مظلومیت اور اس کی نفسیاتی الجھنوں کو اجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ وہ حالات وواقعات کے ذریعے سے کرداروں کے مختلف رنگ وروپ دکھاتے ہیں۔ اس حوالے سے شہزاد منظر لکھتے ہیں۔ "بیدی کی عظمت اور کامیابی کی اصل وجہ یہ کہ وہ فن آگاہ (ART CONSCIOS) ادیب تھے اور اسی چیز نے ان سے شاہکار افسانے لکھوائے۔“(۱۸)

بیدی کے افسانوں کا خمیر زندگی سے کشید کردہ ہے۔ ان کے افسانوں میں زندگی کے مختلف رنگ فنکارانہ بصیرت کے ساتھ جلوہ گر نظر آتے ہیں۔ ان کے ہاں سماجی زندگی کی اہمیت ہے۔ ان کے کرداروں میں زندہ رہنے کی خواہش ہے۔ وہ اپنی عزت اور عظمت کے متلاشی ہیں۔ بیدی کی کہانیوں میں ہندوستانی معاشرے کی تصویریں نظر آتی ہیں۔ ان کے افسانوں میں عام انسانوں کی فطرت کو بیان کیا گیا ہے۔ وہ براہِ راست زندگی کے تجربات اور احساسات سے کہانی کا وجود تخلیق کرتے ہیں۔ ان کی کہانیوں میں انسان کی مختلف حوالوں سے پیدا ہونے والی نفسیاتی کیفیات کا اندازہ ہوتا ہے۔

راجندر سنگھ بیدی کی سماج پر گہری نظر ہے۔ انہوں نے اپنے افسانوں میں معاشرے کی متنوع صورتوں کو اپنے عصری شعور کے ساتھ دکھایا ہے۔ انھوں نے سماجی چہروں کے ساتھ انسانی رشتوں کے نفسیاتی پہلوؤں کو بڑی فنکاری سے واضح کیا ہے۔ بیدی نے زندگی کی حقیقتیں تخیل آمیزی کے ساتھ اور مدھم اور نرم لہجے کے ساتھ بیان کی ہیں۔ مختصر یہ کہ بیدی کا افسانوی سرمایہ اپنے فکری وفنی ترجیحات و امتیازات کی بنیاد پر اردو فکشن کو نئی بلندیوں سے ہم کنار کرتا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ اردو افسانہ روایت و مسائل، گوپی چند نارنگ، مرتب، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۲۰۰۸، ص ۴۰۶

۲۔ راجندر سنگھ بیدی اور ان کے افسانے، مرتبہ اطہر پرویز، ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ، ۲۰۰۶، ص ۸۸

۳۔ طاہر طیب، ڈاکٹر، الاہور میں اردو افسانے کی روایت، مثال پبلی کیشنز، فیصل آباد، 2015، ص، ۲۱۳۔۲۱۴

۴۔ راجندر سنگھ بیدی اور ان کے افسانے، مرتبہ، اطہر پرویز، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ۲۰۰۶، ص: ۱۷۴

۵۔ مرزا حامد بیگ، ڈاکٹر، ''اردو افسانے کی روایت''، دوست پبلی کیشنز، اسلام آباد، ۲۰۱۰ء، ص ۹۰

۶۔ کنہیالال کپور، ''بیدی کے افسانے''، مکتبہ اردو ادب، لاہور، س ن، ص ۲۱۔۲۰

۷۔ بحوالہ، راجندر سنگھ بیدی: شخصیت اور فن، جگدیش چندر دوھاون، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۲۰۰ ، ص ۱۹۸

۸۔ راجندر سنگھ بیدی اور ان کے افسانے، مرتبہ اطہر پرویز، ایجو کیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ۲۰۰۶، ص۲۵۹

۹۔ نکہت ریحانہ خان، ڈاکٹر "اردو افسانہ فنی و تکنیکی مطالعہ"، بک وائز، لاہور، ۱۹۸۸ء، ص۱۰۵

۱۰۔ راجندر سنگھ بیدی اور ان کے افسانے، مرتبہ اطہر پرویز، ایجو کیشنل بک ہاؤس علی گڑھ، ۲۰۰۶، ص:۱۳۰۔۱۲۹

۱۱۔ اسلم جمشید پوری، ڈاکٹر، "ترقی پسند اردو افسانہ اور چند اہم افسانہ نگار، موڈرن پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی، ۲۰۰۲، ص۸۴

۱۲۔ راجندر سنگھ بیدی اور ان کے افسانے، مرتبہ اطہر پرویز، ایجو کیشنل بک ہاؤس علی گڑھ، ۲۰۰۶، ص:۱۵۹۔۱۵۸

۱۳۔ ایضاً، ص:۱۲۱

۱۴۔ محمد حسن، ڈاکٹر، بیدی کا فن، مشمولہ "راجندر سنگھ بیدی کا تنقیدی مطالعہ، مرتبہ مشرف احمد، نفیس اکیڈمی، سندھ، کراچی، ۱۹۸۸، ص۳۱

۱۵۔ طارق چھتاری، ڈاکٹر، "جدید افسانہ، اردو۔ ہندی"، ایجو کیشنل بک ہاوس، علی گڑھ، ۱۹۹۲ء، ص۲۸

۱۶۔ محمد عالم خان، ڈاکٹر، "اردو افسانے میں رومانی رجحانات"، علم و عرفان پبلشرز، لاہور، ۱۹۹۸، ص۳۷۶

۱۷۔ وارث علوی، راجندر سنگھ بیدی کے افسانے (ایک تعارف) مشمولہ، کلیات راجندر سنگھ بیدی (جلد اول، افسانے) مرتب وارث علوی، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی ۲۰۰۸ء ص۲۰

۱۸۔ شہزاد منظر، "علامتی افسانے کے ابلاغ کا مسئلہ" (تنقید)، منظر پبلی کیشنز، کراچی، ۱۹۹۰ء، ص۱۱۴